اقبال کا تصور تعلیم اور عصری صورت حال

(۲)

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ڈاکٹر وحید قریشی

ڈاکٹر وحید قریشی نے شعبہ فلسفہ، جامعہ پنجاب کے تحت اقبال میموریل لیکچر کے سلسلے میں دو خطبات دیئے۔ خطبہ اول جولائی ۱۹۹۴ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا خطبہ اس شمارے میں چھپ رہا ہے جو مسئلہ تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر محیط ہے۔

(ادارہ)

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ان مباحث کی مدد سے لیکچر کے دوسرے حصے پر آتے ہیں تعلیم کے اطلاقی پہلوؤں سے چند اہم سوال ہمارے سامنے آتے ہیں :

۱ ۔ نصابات کس طرح ترتیب دیے جائیں ؟

۲ ۔ مختلف مضامین کی ترجیحات کیا ہوں ؟ (یعنی ان کی درجہ بندی کس طرح کی جائے)؟

۳ ۔ مغربی علوم اکثر ترقی کے نشانات ہیں تو انہیں قبول کرنا کس حد تک ضروری ہے یعنی مغربی علوم سے استفادے کا عمل کیا ہونا چاہیے ؟

۴ ۔ نصاب کا متن کس مواد پر مشتمل ہونا چاہیے ؟

۵ ۔ سائنسی ترقی اور مذہب ایک دوسرے کے خلاف جاتے ہیں یا ایک دوسرے کے مددگار ہیں ؟

۶ ۔ سائنسی علوم اور دیگر جدید علوم کی معاشرے میں کیا اہمیت ہے ؟

۷ ۔ مرد اور عورت کی تعلیم میں کیا فرق ہے اور آزادی نسواں وغیرہ کے مسائل کیا ہیں ؟

۸ ۔ ذریعہ تعلیم کون سی زبان ہونی چاہئے ؟

ان سوالات کو یکجا کر کے چار اہم امور پر گفتگو مرکوز ہو سکتی ۔

الف ۔ نصاب سازی کا طریق کار اور متعلقہ مسائل

ب ۔ تعلیم نسواں اور دیگر امور

ج ۔ قدیم و جدید علوم ، عقل و عشق اور سائنس و مذہب

د ۔ ذریعہ تعلیم کا مسئلہ

(۲)

ان سوالوں کا جواب دینے سے پہلے تمہیداً دو باتوں کا ذکر ضروری ہے کہ اول یہ کہ علامہ اقبال سماجی زندگی کو اہمیت دیتے تھے اور اسے روحانی اقدار کے لئے استعمال بھی کرنا چاہتے تھے ۔ اس لئے انہوں نے سماجی علوم کو بنیادی اہمیت دی ہے ۔ خصوصاً تاریخ کو ایک ایسا مضمون قرار دیا جو حال اور مستقبل سے مربوط اور زندگی کی سمت متعین کرنے میں کارگر ہے ۔ ان کی نظر میں مسلمانوں کے لیے تاریخ کا مطالعہ ملی شناخت کا ناگزیر حصہ ہے ۔ اسی حوالے سے انہوں نے جملہ مضامین کی درجہ بندی کی ہے ۔

قرون وسطی میں تعلیم ریاست کی ذمہ داری نہ تھی بلکہ مسجدیں مرکزی اہمیت رکھتی تھیں اور جملہ علوم و فنون کی نشوونما دینی علوم کے توسط سے ہوتی تھی ۔ مطالعہ قرآن کو مرکزی اہمیت حاصل تھی ۔ علوم حدیث اور دوسرے جملہ علوم اسی بنیادی کتاب کے گرد اپنا مقام متعین کرتے تھے ۔ افراد اداروں سے زیادہ اہم تھے ۔ یہ نظام برطانوی دور کے مقابلے میں زیادہ آزاد اور حکومتی اثرات سے پاک تھا ۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں سرسید کی تحریک سے تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلی آئی ۔ معاشرتی زندگی نئے دور میں داخل ہو گئی ۔ پرانا جاگیر دارانہ طبقہ زوال پذیر ہو کر مرکزی اہمیت کھو بیٹھا ۔ اس کی جگہ ایک نئے ابھرنے والے متوسط طبقے نے لینی شروع کر دی ۔ آئندہ چل کر مسلمانوں میں جو احیائی تحریکیں ابھریں ان میں متوسط طبقے نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ آئندہ سو سال تک یہی متوسط طبقہ جدید تعلیم کا نقیب رہا ۔

پرانا نظام تعلیم مسجدوں اور دینی اداروں میں سمٹ کر رہ گیا ۔ اب مسلمانوں کی معاشرتی زندگی دو دائروں میں بٹ گئی ایک دائرہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کا تھا جو مغرب کے ترقی یافتہ اور مغربی علوم سے استفادہ کرتے ہوئے سماجی زندگی میں سرگرم کار تھے ، دوسرا طبقہ دینی عالموں کا تھا جو پرانے نصابات پڑھاتے اور مغربی علوم سے نا آشنا تھے ۔ اس کی آواز عوام میں جاری و ساری رہی ۔ عملاً مسلمان انہیں دو طبقوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے ۔ یہ الگ الگ دنیاؤں کے باشندے تھے اور ایک دوسرے سے بالکل ناواقف ۔ نئے علوم اور نئی سائنسی ترقیات کے زیر سایہ متوسط طبقے نے مسلمانوں کی عمومی راہنمائی کا فریضہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مسلم معاشرے میں بنیادی تبدیلیوں کے ذریعے اسے فعال بنایا ۔

علامہ اقبال ابتدائی چند برس قدیم طرز کے مدرسوں میں پڑھتے رہے پھر انگریزی تعلیم کی طرف آ گئے ۔ انہیں دونوں نظام کی خامیوں اور خوبیوں کا ذاتی تجربہ تھا ۔ ان کی سوچ میں مغرب سے آنے والے علوم کا حصہ زیادہ تھا ۔ انہوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ دونوں دائروں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے ۔ مغربی نوجوانوں کو مذہبی اور دینی تعلیم سے آشنا کیا جائے اور طبقہ علما کو جدید علوم سے آگاہ کر کے فعال بنایا جائے ۔

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ علامہ علمائے دین کے خلاف تھے ۔ یہ صحیح نہیں ۔ انہوں نے علمائے دین کا ہمیشہ احترام کیا اور ان کی اہمیت کو ہمیشہ تسلیم کیا ۔ محفل میلاد النبی والے مقالے میں یہ کہا کہ تعلیم سے زیادہ اس قوم کو تربیت کی ضرورت ہے اور ملی اعتبار سے یہ تربیت علماء کے ہاتھ میں ہے ۔ یہ بھی عرض کردوں کہ میری ذاتی رائے میں اکبری الحاد کے خلاف جو آواز برصغیر میں اٹھائی گئی اور مغلیہ عہد میں اسلام عام مسلمانوں میں برقرار اور بحال رہا تو یہ کارنامہ بھی علماء ہی نے ادا کیا تھا ۔ سیرت رسول اور علم حدیث کے ذریعے یہ عظیم کارنامہ انجام دیا گیا ۔

اب یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ اسی طبقے میں علماء سوء بھی شامل ہو گئے ہیں جنہیں علامہ نے " ملا " کہا ہے اور ان کی بھرپور مخالفت کی ۔ مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں میں الحاد کی جو لہر چل رہی تھی علامہ اس کے بھی سب سے بڑے مخالف تھے ۔ انہوں نے ملا اور مسٹر دونوں کو رد کیا ۔ ان کا آئیڈیل مسلمان تو وہ ہے جو مغربی علوم سے بھی استفادہ کرتا ہے اور دین کی رسی بھی مضبوطی سے پکڑتا ہے وہ ایک طرف تو دینی مدرسوں کو جدید علوم سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں اور حکومت کے تسلط سے آزاد تعلیم کے حامی ہیں اور دوسری طرف متوازی سرکاری تعلیمی نظام کو بھی مذہبی تعلیم سے آشنا کر کے مسلمان کرنا چاہتے ہیں ۔ دین کی تعلیم سرکاری مدارس میں تو ممکن نہ تھی لیکن ملحقہ کالجوں اور مدارس میں (جو انجمنیں اور ادارے چل رہے تھے) دینی تعلیم کو شامل کرنے کی مہم علامہ نے کی ۔ انجمن حمایت اسلام کی قائم درس گاہوں میں یہ کوشش کی گئی ۔ بلکہ ۱۹۱۸ء میں " ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر " میں ہندوستان میں ایک الگ مذہبی یونیورسٹی کا تصور بھی دیا ۔ فرماتے ہیں :

> " قلیل البضاعت مسلمان جو سینے میں ایک درد بھرا اسلامی دل رکھتا ہو ، میری رائے میں قوم کے لیے بمقابلہ اس بیش قرار تنخواہ پانے والے آزاد خیال گریجویٹ کے زیادہ سرمایہ نازش ہے ، جس کی نظروں میں اسلام اصول زندگی نہیں ہے بلکہ محض ایک آلہ جلب منفعت ہے ، جس کے ذریعہ سے بڑے بڑے سرکاری عہدے زیادہ تعداد میں حاصل کئے جا سکتے ہیں ۔ میری ان باتوں سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ میں مغربی تہذیب کا مخالف ہوں ۔ اسلامی تاریخ کے

ہر مبصر کو لا محالہ اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہمارے عقلی اور ادراکی گہوارے کو جھلانے کی خدمت مغرب ہی نے انجام دی ہے ۔ فلسفیانہ تخیل کی سرزمین میں ہم شاید ابھی تک بجائے عربی اور ایرانی ہونے کے ، زیادہ تر یونانی نظر آ رہے ہیں ۔ بایں ہمہ اس سے کسی کو انکار نہ ہو گا کہ خود ہماری خالص اسلامی تہذیب اپنی مثال آپ ہے اور تعلیم کا کوئی جدید اسلامی نظام متعلمین کی قومیت پر حرف لائے بغیر اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا ۔ اسلامی یونیورسٹی کے خیال کا ہمارے دل میں پیدا ہونا حقیقت میں ہماری قومی ہستی کے حق میں ایک مبارک علامت ہے ۔ جب ہم اپنی قوم کی نوعیت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس قسم کے دارالعلم کی ضرورت میں شک اور شبے کی مطلق گنجائش نہیں رہتی بشرطیکہ یہ دارالعلم خصوصاً اسلامی اصول پر چلایا جائے ۔ کوئی قوم اس رشتے کو یک بیک نہیں توڑ سکتی جو اسے اس کے ایام گزشتہ سے جوڑے ہوئے ہے ۔ اور مسلمانوں کے لیے تو اس تعلق کو چھوڑ دینا اور بھی محال ہے ، جن کی مجموعی روایات ان کی قومیت کی جان ہیں ۔ مسلمانوں کو بے شک علوم جدیدہ کی تیز یا رفتار کے قدم بہ قدم چلنا چاہئے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص ہو ۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو جسے ہم اپنی قومی تعلیم کا مرکز قرار دے سکیں ۔ ہم کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیت کے پودے کو اسلام کے آب حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اپنی جماعت میں پکے مسلمان کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں ۔ بلکہ ایسا نیا گروہ پیدا کر رہے ہیں جو بہ وجہ کسی اکتسابی یا اتحادی مرکز کے نہ ہونے کے اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا اور گرد و پیش کی ان قوموں میں سے کسی ایک قوم میں ضم ہو جائے گا جس میں اس کی بہ نسبت زیادہ قوت و جان ہو گی ۔

لیکن ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قائم ہونا ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے ۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علماء اور واعظ انجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں ، اس لیے کہ ان کا مبلغ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے اخلاق اور مذہب کے اصول و فروع کی تلقین کے لیے موجودہ زمانہ کے واعظ کو تاریخ ، اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق عظیم سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری

دسترس رکھنی چاہئے ۔ الندوہ ، علی گڑھ کالج ، مدرسہ دیوبند اور اس قسم کے دوسرے مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں ، اس بڑی ضرورت کو رفع نہیں کر سکتے ۔ ان تمام بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دارالعلم ہونا چاہئے جہاں افراد قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشو و نما دینے کا موقع حاصل کر سکیں بلکہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ تیار کیا جا سکے جس میں زمانہ موجودہ کے ہندوستانی مسلمانوں کو ڈھالنا چاہئے ۔ پس یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی دارالعلم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب دل کش انداز سے ہوئی ہو اس قسم کی تصویر مثالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے ۔ اس کے لیے اعلیٰ تخیل ، زمانے کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے "

علامہ تعلیمی نظام میں دو طرفہ اصلاح کر کے اور اسے مربوط کر کے ایک جامع نظام تعلیم وضع کرنے کا شدید احساس رکھتے تھے ۔

ہماری معاشرتی دوئی ہی ہماری جملہ خرابیوں کا اصل سبب ہے اور علامہ اقبال اسی کو دور کرنا چاہتے ہیں ۔

(۳)

اگر آج کی سماجی زندگی کو سامنے رکھیں تو پاکستان میں نظام تعلیم طبقاتی تضاد کا شکار ہے ۔ ۱۹۵۸ء کے بعد اقتصادی اور صنعتی ترقی نے ہمارے معاشرے کو بڑی حد تک بدلنا شروع کر دیا ہے ۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سے اس کی رفتار میں بہت تیزی آئی ہے ۔ نتیجتاً ہمارا معاشرہ پوری طرح دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ۔ اقتدار کی زمام جو پہلے متوسط طبقے کے ہاتھ میں تھی رفتہ رفتہ دولت مند طبقے کے ہاتھ میں چلی گئی ۔ سوسائٹی میں امیر کے امیر تر اور غریب کے غریب تر ہونے کا عمل شروع ہو چکا ہے ۔ آج درمیانہ طبقہ نہ ہونے کے برابر ہے اور معاشرتی زندگی میں راہ نما حیثیت نہیں رکھتا ۔ حکومت کا نظم و نسق دولت مند طبقے کے ہاتھ میں ہے ۔ ملک کی زیادہ آبادی غریب ہے ، جس کا زیادہ حصہ دیہات میں بستا ہے ۔ ۷۴ فیصد دیہاتی ہیں اور ۲۶ فیصد شہری ۔ عمودی تقسیم کے لحاظ سے معاشرہ امیر اور غریب میں منقسم ہے ۔ اہل ثروت حاوی ہیں اور غریب نان جویں کے محتاج ۔ تعلیم شہروں میں بھی دو حصوں میں بٹ چکی ہے ۔ امیر اور اوپر کا متوسط طبقہ انگلش میڈیم سکولوں سے آ رہا ہے

اور غریب اور نچلا متوسط طبقہ اردو میڈیم سے ہے ۔ ذریعہ تعلیم کا مسئلہ سیاسی سے زیادہ اب طبقاتی شکل اختیار کر چکا ہے ۔ یہ معاشرتی تبدیلی زمانہ حال کی پیداوار ہے ۔ علامہ کے دور میں صرف متوسط طبقے کی حکمرانی تھی اور اس وقت زندگی اتنی پیچیدہ بھی نہ تھی جتنی اب ہے ۔

علامہ کے تصورات کو موجودہ دور پر منطبق کرتے ہوئے ہمیں ان معاشرتی حقائق کو پیش نظر رکھنا ہو گا جو ہماری سماجی زندگی میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں ۔ سیاہ و سفید کا مالک دولت مند طبقہ مغربی تعلیم اور مغربی طرز بود و باش کا دلدادہ ہے جس میں اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت نہیں ، غریب طبقہ تعلیم سے پوری طرح بہرہ ور نہیں اور معاشرتی تضاد کا شکار ہے ۔ اس لیے لازمی تعلیم کے وہ قوانین عملاً رائج نہیں ہو سکے جن کی بنا پر تعلیم ہر آدمی کا پیدائشی حق قرار پائی ہے ۔ تعلیم خواص کا حق ہو گئی ہے اور اس کے لیے خواص کے الگ ادارے بھی قائم ہیں ۔ معاشرے میں بے اطمینانی بڑھ گئی ہے جس کا علاج تعلیمی سطح پر بھی مطلوب ہے ۔

(۴)

علامہ اقبال جبری تعلیم کے حامی تھے ۔ ۱۸ فروری ۱۹۱۲ء کو حبیبیہ ہال لاہور میں مسٹر گوکھلے کی تجویز کی تائید میں جلسہ ہوا اس کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی تھی ۔ یہ ایک لحاظ سے جبری تعلیم پر تیسرا جلسہ تھا ۔ لازمی تعلیم کے بل کا لفظ " جبر " زیر بحث تھا ۔ علامہ اقبال اس جبر کے حامی ہیں ۔ ان کی رائے میں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آشنا کرنے کے لیے جبری تعلیم ضروری ہے ۔ اس قانون کا براہ راست اثر سرکاری طور پر چلنے والے اداروں کے علاوہ مسلمانوں کے ان اداروں پر پڑتا تھا جو انجمن حمایت اسلام اور بعض دوسری جماعتیں ملک کے طول و عرض میں چلا رہی تھی ۔ علامہ اس حق میں تھے کہ جبری پرائمری تعلیم کو رائج کیا جائے ۔ فرماتے ہیں :

> " لفظ 'جبر' سے کسی کو کھٹکنا نہ چاہئے ۔ جس طرح چیچک کا ٹیکہ لازمی اور جبری قرار دیا گیا ہے اور یہ لزوم و جبر اس شخص کے حق میں کسی طرح مضر نہیں ہو سکتا جس کے ٹیکہ لگایا جاتا ہے ، اس طرح جبریہ تعلیم بھی قابل اعتراض متصور نہیں ہو سکتی ۔ جبریہ تعلیم بھی گویا روحانی چیچک کا ٹیکہ ہے ۔ اسلام میں جبر کی تعلیم موجود ہے ۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ اپنے بچوں کو زبردستی نماز پڑھائیں ۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس جبریہ تعلیم کے قانون کی حد میں لڑکیاں بھی آ جائیں گی مگر ہم چاہیں تو اس شق کو قانون سے نکلوانے کی کوشش کر سکتے ہیں "

علامہ جب پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر ہوئے اس زمانے میں انہوں نے پنجاب میں جبری تعلیم کو عملاً نافذ کرنے پر شدت سے اصرار کیا ۔ اس کی تفصیلات علامہ کی پنجاب کونسل کی تقاریر میں موجود ہیں ۔ لازمی تعلیم کے قانون کی منظوری کے بعد اسے موثر طور پر نافذ کرنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی ، اس لیے علامہ نے لازمی تعلیم کا سوال شد و مد سے اٹھایا تھا ۔

(۵)

اب ہم نصابات کے اطلاقی پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہیں ۔
علامہ نے ابن خلدون کی طرح تعلیمی ادوار کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے :
الف) بچوں کی تعلیم و تربیت
ب) پرائمری سے میٹرک تک کا دور
ج) ثانوی اور اعلیٰ تعلیم
د) تحقیق

الف ۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد علامہ خود استاد رہے ۔ کالج کی سطح تک تدریس کا انہیں براہ راست تجربہ ہوا ۔ وہ ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو اورینٹل کالج میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے اور درسی کتب کی تدوین بھی کرتے رہے ۔ گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج میں بھی وہ مختصر وقفوں سے تدریس میں شریک رہے ۔ تاریخ ، فلسفہ ، سیاست مدن کی تعلیم ان کے فرائض میں شامل تھی ۔ ان کی اس زمانے کی تصانیف میں علم الاقتصاد بھی ہے جو علامہ کا پہلا تحریری کارنامہ تھا ۔ ۱۹۰۵ء تک وہ گورنمنٹ کالج کے استاد رہے اور انگریزی ادب و شاعری ، فلسفہ اور تاریخ کے مضامین سے بھی متعلق رہے ۔ پھر ۱۹۱۸ء میں کچھ عرصہ اسلامیہ کالج میں فلسفے کی تدریس بھی کی ۔ جب وکالت شروع کی تو اس زمانے میں بھی نصاب سازی میں یونیورسٹی کے مختلف مضامین میں ان کی شرکت بدستور رہی ۔ عربی ، فارسی ، فلسفہ اور تاریخ یہ وہ میدان تھے جن میں علامہ اقبال کی براہ راست دلچسپیاں رہیں ۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے ڈاکٹر ملک حسن اختر کی کتاب اقبال ۔۔۔۔۔ ایک تحقیقی مطالعہ ، ص ۸۵ تا ۱۴۵ ، ۱۴۷ تا ۳۱۹)

بچوں کی تعلیم و تربیت کے عنوان سے رسالہ مخزن جنوری ۱۹۰۲ء میں انہوں ایک مضمون لکھا اور پرانے طریقہ تعلیم پر اعتراض کیا (مقالات اقبال ص ۱ تا ۹) کہ اس میں بچوں کے قوائے عقلیہ اور واہمہ کے مدارج نمو کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ۔ اور علامہ نے اس نظام کو سخت مضر قرار دیتے ہوئے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بعض بنیادی نکات بیان کئے ۔ اس مضمون میں انہوں نے تعلیم کو تربیت سے الگ نہیں کیا اور پورا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ تربیت کو اولین اہمیت حاصل ہے ۔ پھر طریقہ تعلیم کے علمی اصول کو بیان کرتے ہوئے " آغاز عالم طفلی " کو زیر بحث لاتے ہیں ۔ بچوں کی " اضطراری حرکت کے میلان " کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے قواء کے حرکات کو تعلیمی فائدے کے لیے استعمال کی ترغیب دی ہے ۔ " مثلاً " اینٹوں کے گھر بنانا ، لڑی میں منکے پرونا ، گانا وغیرہ " کے ذریعے بچے کی نشو و نما پر زور دیا ۔ " زائد اعصابی قوت (جو رونے اور بے جا شور کرنے میں صرف ہوتی ہے) کو باقاعدہ تصویر یا راگ میں منتقل کرنے پر زور دیتے ہیں ۔ نیز جو قوت " ضرر رساں اشیا کو چھونے اور چیزوں کو ادھر ادھر پھینکنے میں صرف ہوتی تھی اسے (انہوں نے) گھر بنانے میں صرف کرنے " کا مشورہ دیا ہے ۔

بچے کی نفسیات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ " بچہ مسلسل توجہ نہیں کر سکتا " اس لیے ان کا مشورہ ہے کہ " سبق طویل نہ ہوں ، چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہوں ، ہر سبق میں ایک خاص مشترک بات ہو تاکہ ایک خاص مقام پر توجہ لگانے کی عادت بھی ترقی کرتی جائے "

بچوں کی قوت مشاہدہ کے حوالے سے انہوں نے زور دیا ہے کہ " پانچوں حسیں تین مہینے کے بچے میں بیدار ہونے لگتی ہیں ۔ سبق پڑھاتے ہوئے جس شے کا بتایا جائے بچے کے ہاتھ میں دی جائے ، مشاہدہ سے بصر کی تربیت ہوتی ہے ، چھونے سے لمس کی اور گفتگو یا راگ سے سماعت کی ۔ لمس اور بصر کے استعمال سے اشیاء کا ادراک پیدا ہو گا "

بچے کو صورت سے چل کر رنگ کی طرف لے جانا بھی ضروری ہے ۔ " شوخ رنگ بچوں کو پسند ہیں (اس لیے) رنگین تصویریں بچے کے لیے درسی کتابوں میں ضروری ہیں "

" بچے دوسروں کی نقل کرتے ہیں " اس سے بھی فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے ۔ " استاد اپنی مثال بچے کے سامنے پیش کرنے تاکہ اس کے ہر فعل کی نقل کرنے کی تحریک ہو " اس کے علاوہ بچے کی قوت متخیلہ بڑھانے کی ضرورت ہے ۔ اکثر مکتبوں میں لڑکے کاغذ کی کشتیاں دن رات بنایا کرتے ہیں جس سے قوت واہمہ تشکیل پاتی ہے "

20921

اقبال کا تصورِ تعلیم اور عصری صورت حال

اخلاقی تربیت پر بھی علامہ خاص طور سے توجہ دلاتے ہیں ۔ " ہمدردی کے متعلق عمدہ عمدہ کہانیاں سنانا اور یاد کروانا، حیوانوں کے متعلق سبق دیتے ہوئے اچھا سلوک کرنے کی مثال پیش کرنا ۔ قوت متمیزہ کی ترقی کے لیے شے اور شکل کا الگ الگ تصور دیا جائے ۔ مثلاً گیند کا دوسری پہلو دار شے سے مقابلہ کر کے اس کے باریک باریک اختلافات واضح کیے جائیں "

" بچے کے قوائے عقلیہ یعنی تصدیق اور استدلال کمزور ہوتے ہیں ۔ اس سے ایسے تصورات کے علم کی توقع نہیں رکھنی چاہئے ------- جس کے ضمنی مدرکات کا علم ہی اس کو نہیں ------- مثلاً ایک برس کے بچے کو حب وطن کا مجرد تصور یا خدا کی صفات کا تصور ذہن نشین نہیں ہو سکتا ۔ یہ قواء وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے ہیں "

" اخلاقی محرکات سے بچہ عموماً کوئی اثر نہیں لیتا ۔ اس اثر کو عملی زندگی کے دائرے میں ظاہر کرنا اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے " اس لیے " بچے میں اخلاقی تحریکوں سے متاثر ہونے کی قابلیت پیدا کرنی چاہئے ۔ نفس ناطقہ قواء کا ایک مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ اپنی ذات میں ایک واحد غیر منقسم شے ہے ۔ ہر ایک قوت کی نشو و نما ہر دوسری قوت کے نشو و نما پر منحصر ہے ۔ جس طرح جسمانی اعضاء بڑھتے ہیں اسی طرح نفس ناطقہ کے تمام قواء بھی بڑھتے ہیں ۔ ادراک ، تخیل ، تاثر اور مشیت وغیرہ ۔ ہر قوت کو تحریک دینے کی ضرورت بہر حال رہتی ہے "

علامہ نے ابتدائی تعلیم و تربیت کے لیے اس مضمون میں جو سانچہ مہیا کیا ہے اس میں نفسیات کے علم سے فائدہ اٹھایا ہے ۔ کنڈر گارٹن کے تصورات ان کے ہاں شاید جرمنی کی رہائش کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں ۔ اس نظام میں اخلاقی پہلو انہوں نے خود سے شامل کیا ہے کیونکہ وہ اخلاقی اور دینی تربیت کو لازمہ تعلیم جانتے تھے ۔ ان کے رائے میں :

> " مذہب قوم میں ایک متوازن سیرت پیدا کرتا ہے جو حیات ملی کے مختلف پہلوؤں کے لیے بیش بہا ترین (؟) سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ بہ حیثیت مجموعی یورپ نے اپنے باشندوں کی تعلیم و تربیت میں مذہب کا عنصر حذف کر دیا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس بے لگام انسانیت کا حشر کیا ہو گا "

ایک اور اہم نکتے پر بھی علامہ نے خاص توجہ کی ۔ وہ تعلیم اور تعلم کو " مادری زبان " کے وسیلے سے سکھانے کا طریقہ ہے ۔ یاد رہے کہ ۱۹۰۲ء میں علامہ نے " مادری زبان " کی ترکیب استعمال کی تھی آگے چل کر ساری زندگی " مادری " کا لفظ استعمال نہیں کیا کیونکہ اس کا رشتہ قومیت کے مغربی تصور سے وابستہ ہو جاتا تھا ۔ ان کے لسانی تصور میں

زبانیں محض استعمال کی چیز ہیں پوجا کی چیز نہیں ۔ وہ مغربی زبانوں کو اپنے ملک میں ذریعہ تعلیم بنانے کے حق میں نہیں کیونکہ نفسیاتی طور پر اپنی زبان کے وسیلے سے جو گرفت مطالب پر ہوتی ہے وہ غیر زبان میں ممکن ہی نہیں ۔

(۲)

ب ۔ ۱۹۰۲ ء سے لے کر ۱۹۱۲ ء تک علامہ کی سوچ میں کچھ بنیادی تبدیلیاں آئیں ۔ قومیت کے مغربی تصور کو انہوں نے بالکل خیر باد کہا اور اس کی جگہ ملت کا تصور اختیار کر لیا ۔ اس زمانے میں شخصیت کی تعمیر کے حوالے سے خودی کا تصور اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ ان کی توجہ کا مرکز ہو گیا ۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنے مضامین اور مکاتیب میں جابجا کیا ہے ۔

یہ وہ دور ہے جب وہ درسی کتابوں کی تدوین میں بھی مصروف ہوئے لیکن اس وقت ہندوستان میں درسی کتابیں پڑھنے والے ہندو اور سکھ اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی تھے اس لیے ان میں وہ اپنے عقائد کو پوری طرح پیش نہیں کر پائے ۔

اردو زبان میں تاریخ ہند کا جو سلسلہ ان کے نام کے اشتراک سے ملتا ہے (۱۹۱۳ ء) ان کا اپنا تیار کیا ہوا نہیں لگتا ، بلکہ صرف ان کا نام برتا گیا ہے (اقبال ایک تحقیقی مطالعہ ۔۔۔ ملک حسن اختر ۱۹۸۸ ء ص ۱۶۴) یہ شاید ان کی مالی مجبوری تھی لیکن اردو میں جو سلسلہ ادبیہ کے عنوان سے ' سلسلہ کتب دستیاب ہے اور پانچویں ، چھٹی ، ساتویں اور آٹھویں کے لیے درسی کتب کے طور پر تیار ہوا وہ البتہ ان کی شرکت کا غماز ہے ۔ اس میں حکیم احمد شجاع شریک مصنف تھے ۔ کتابوں میں ہندو طلباء بھی پیش نظر ہیں ۔ یہ ہسٹر ، راجہ ہریش چند ، راجا مایا داس ، سنجوگتا ، رام چندر جی کابن باس ، رام شاستر ، درو پدی ، دادا بھائی نوروجی ، والمیک وغیرہ پر سبق اور نظمیں ہیں ۔ ان کے ساتھ ساتھ علامہ نے عام اخلاقی مسائل قناعت ، موعظہ حسنہ ، اخلاقی جرات ، ایمان کا فیصلہ ، خدمت خدا و خلق ، عزت ، اور مسلمان بادشاہوں اور شہزادیوں ، شیر شاہ سوری ، بابر ، شاہ جہاں ، تاج محل ، شہنشاہ اکبر کے حالات اور حب الوطنی کے تصورات بھی شامل کیے ہیں ۔ مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کی جھلکیوں کے علاوہ میرا وطن بھی شامل ہے ۔ تصور وطنیت میں یہ غور طلب ہے کہ اس میں دھرتی پوجا کا درس نہیں دیا گیا ۔

ہر کتاب میں ایک دیباچہ بھی ہے جس میں مولفین نے اپنے طریقہ کار کی وضاحت کی ہے ۔ " اردو کی مروجہ درسی کتابوں میں (انہیں) نفس مضمون اور انداز تحریر ، طریقہ انتخاب کے حوالے سے زمانہ حال کے مطالبات " پورے ہوتے نظر نہیں آتے ۔ پرانے

اساتذہ فن کے مقابلے میں زمانہ حال کے انشا پردازوں اور شاعروں کے مضامین نظم و نثر کی شمولیت ایک اہم تبدیلی تھی۔

اس سے قبل تدریس اردو میں کلاسیکی نثر پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی جس سے قدیم ادبی زبان تو آ جاتی تھی لیکن زبان کو بطور ایک زندہ اور قابل استعمال ذریعہ اظہار پس پشت ڈال دیا جاتا تھا۔ علامہ کی درسی کتب میں باغ و بہار کے اقتباسات یا سب رس میں سے انتخاب شامل نہیں کیونکہ اس سطح پر اردو کی تدریس کا مقصد ایک زندہ زبان کے طور پر پڑھانا اور مختلف علوم میں طلب علموں کی استعداد بڑھانا تھا۔ اس لیے ان اسباق میں سائنس کے کرشمے، ویل مچھلی اور بعض دوسرے موضوعات درج ہیں۔

ان میں اخلاقی پہلو نمایاں ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کتاب کے وسیلے سے اخلاقی اور دینی رجحان کو تقویت دی جائے، اس لیے اخلاقی اور دینی باتوں پر بھی مناسب زور دیا گیا ہے۔

نصابی کتب کی زبان کی اصلاح پروفیسر شاداں بلگرامی نے کی اردو تدریس کے نقطہ نظر سے تین کتابوں کے اسباق پر نظر ثانی کا کام شیخ عبدالمجید پروفیسر سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور نے انجام دیا تھا۔

(۷)

علامہ نے نویں دسویں کے لیے آئینہ عجم بھی ترتیب دی جس کا سال اشاعت بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ۱۹۲۶ء اور بقول عبدالجبار شاکر ۱۹۲۷ء ہے۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی (ایضاً ص ۱۲۳) اور یہی اطلاع درست ہے۔

مدت سے علامہ کا ارادہ تھا کہ فارسی نصاب ترتیب دیا جائے، اس میں دوہرے مقاصد تھے، فارسی زبان کو بطور ایک زندہ زبان کے پڑھانا اور قدیم علمی سرمائے کی بازیافت اور ادبی روایات کا استحکام۔ پروفیسر محمد اکبر منیر صاحب سے علامہ نے خاص طور پر فرمائش کی کہ وہ ان کے لیے ایران کے جدید شعرا اور نثر نگاروں کی بعض کتابیں لائیں۔ فرماتے ہیں:

> "عرصے سے میرا ارادہ ایک انٹرنس کورس فارسی ترتیب دینے کا ہے -- فارسی نظم و نثر کے کچھ عمدہ اور آسان نمونے مل جائیں تو یہاں کے طلباء کے لیے نہایت مفید ہوں۔ اگر آپ چند کتب نظم و نثر ہوں، تو میرے لیے خرید لیجئے، نظمیں مشہور اساتذہ حال کی ہوں اور سلیس اور آسان طرز جدید میں لکھی گئی ہوں تو زیادہ مفید ہے۔ پولیٹیکل نظموں کی ضرورت نہیں -----

غرضیکہ یہاں انٹرنس کے طلبا کی ضرورت کو آپ بخوبی سمجھتے ہیں ۔ میرا مقصود یہ ہے کہ فارسی کے ذریعہ سے جدید خیالات و احساسات طلبائے ہند تک پہنچیں ۔ انگریزی کورسوں میں مضامین کا تنوع نہایت دلچسپ ہے ۔ انتخاب میں وہ بھی زیر نظر رہے "

نظموں میں انہوں نے مناظر والے اقتباسات کو زیادہ اہمیت دی ہے یا پھر ایسی نظموں کو جن میں منظر کشی پر زور ہے ۔ نصاب میں علامہ نے دو نظمیں اپنی بھی شامل کیں جن میں درس عمل دیا گیا تھا سعدی ، انوری ، فردوسی اور عماد کا کلام بھی ہے جس میں اخلاقی ٹون توجہ طلب ہے ۔ عصر حاضر کے شاعروں میں وہ اپنے علاوہ ایک آدھ کو ہی شامل کر پائے ہیں ۔ سبب شائد یہ ہے کہ ہندوستان میں انہیں جدید شعرا کا کلام دستیاب نہیں تھا ۔

موجودہ شکل میں نثری حصے میں ان کے پیش نظر ایران کی معاشرت اور جغرافیہ ہے تاکہ برصغیر کا طالب علم ایرانی زندگی سے آشنا ہو جائے ۔ سید محمد علی جمال زادہ کا "ملت و دولت ایران" محمود طرزی کا افسانہ "ماطلید" مالکم خان کا ڈرامہ "سرگزشت شاہ قلی میرزا" اور "سیاحت نامہ ابراہیم بیگ" کے دو اقتباس (قزوین اور مراغہ کے بارے میں) شامل ہیں ۔ نثر میں انہوں نے صرف جدید نثر پر بھروسا کیا ہے اور قدیم نمونے شامل نہیں کیے ۔

صحیح صورت حال یہ ہے کہ علامہ نے پہلے ایڈیشن میں ہمایوں نامہ ، کلیہ و دمنہ ، قابوس نامہ ، حکایات حکیم قاآنی ، آشیان بلبل ، محاورہ سیاح بایکے از وحشیان امریکائے شمالی اور مجادلہ درمیان علوم و فنون ، پروانہ اور ماہ و انجم بھی شامل نصاب کیے تھے ۔ جن میں اکثر کا تعلق قدیم نثری علمی سرمائے سے ہے ۔ بعد کے ایڈیشنوں میں یہ سارا حصہ نصاب سے خارج کر دیا گیا تھا ۔ (ایضاً ص ۱۶۷ ، ۱۶۸) اس لیے نصاب کی آخری شکل علامہ کے تصورات کی صرف جزئی نمائندگی کرتی ہے اور اس میں قدیم علمی و ادبی ورثے کی حفاظت کا تصور صرف اشعار ہی میں باقی رہ سکا ہے ۔

(۸)

تعلیم کی اعلیٰ سطحوں کی بات کرتے ہوئے علامہ کے تصورات کے بارے میں دو پہلوؤں پر غور ضروری ہے ۔ ایک تو یہ کہ قرآن حکیم سے (تعلیم کے حوالے سے) کیا بنیادی فکر ظاہر ہوتی ہے ؟ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی سماجی تاریخ میں مختلف علوم کی کیا اہمیت رہی ہے ؟

اس حوالے سے سورہ آل عمران کی آیات ۹۰ - ۹۱ پر غور کرنا ضروری ہے۔علامہ اقبال نے ان آیات مبارکہ پر غور کیا اور یہ بتایا کہ قرآن پاک نے انسان کے داخلی تجربے کو علم میں نمایاں جگہ دی ہے اور علم کو عمل کا پابند کیا ہے - دوسرے بعض آیات کریمہ میں علم کے ذرائع کی طرف بھی اشارہ ہے یعنی مظاہر قدرت اور تاریخ کا مطالعہ۔قرآن پاک حقائق کے بارے میں مظاہر فطرت میں اشارات کی موجودگی کی طرف توجہ دلاتا ہے - مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان " نشانیوں " پر غور کریں اور ان مطالب کی مدد سے زندگی کی حقیقتوں میں پوشیدہ معانی کا مطالعہ کریں - مادی حقائق پر غور مسلمانوں کے فکر کا لازمی عنصر ہے - تاریخ کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے قوموں کے ماضی کے احوال معلوم ہوتے ہیں - ماضی کی مدد سے حال و مستقبل کو سنوارنے کا لائحہ عمل وضع کیا جا سکتا ہے - مطالعہ تاریخ سے حیات و کائنات کو کل کے طور پر دیکھنے کا شعور ملتا ہے اور انسان ادراک اشیا کے ذریعے روحانی و وجدانی حقائق تک رسائی پاتا ہے - مذہب کو مرکزی اہمیت حاصل ہے جس کے بغیر زندگی کا کوئی شعبہ بھی صحیح نتائج کے استخراج میں معاون نہیں ہو سکتا ، کیونکہ مذہب کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں کے باہمی ربط سے ہے - مادی زندگی پوری حقیقت کی نمائندگی نہیں کرتی ، نہ روحانی زندگی مادی زندگی سے الگ ہو کر حقائق کی شناخت کر سکتی ہے - اس لیے کائنات کے مادی پہلو بھی قابل توجہ ہیں اور سائنسی علوم بھی اہم ہیں - سائنس حقیقتاً اشیا تک رسائی کا ایک وسیلہ ہے - سائنس علم کی ایک قابل اعتماد شاخ ہے اس سے حقائق کی خارجی طور پر تصدیق ممکن ہے ، اس سے آئندہ کے بارے میں پیش گوئی ہو سکتی ہے اور واقعات پر کامل اختیار بھی مل سکتا ہے - یہ دوسری بات ہے کہ سائنس حقائق کی پہچان کا واحد ذریعہ نہیں - یہ حقیقت کا ایک حصہ ہے پوری حقیقت نہیں - دوسرا حصہ مذہب سے حاصل ہو گا اور دونوں کے ملاپ سے حقیقت ایک کل کی صورت پاتی ہے -

سائنسی علوم ، سماجی علوم ، فنون لطیفہ ، فلسفیانہ علوم کوئی بھی قائم بالذات نہیں اور اکیلے اکیلے رموز حیات کا انکشاف نہیں کرتے بلکہ جملہ علوم و فنون حقائق کی تہہ تک پہنچنے کے وہ مختلف راستے ہیں جو سماجی زندگی کے تسلسل میں اپنا آپ ظاہر کرتے ہیں -

قرآن پاک ہماری تعلیم کا بنیادی رکن ہے - مسلمانوں کی سماجی تاریخ کے دھارے میں نصاب علم کو مرکزی اہمیت حاصل تھی - مکتبی تعلیم سے لے کر اعلیٰ درجات تک مطالعہ قرآن کی خاطر دیگر علوم کو ترقی ملی - علوم و فنون کی درجہ بندی بھی اس حوالے سے ہوئی - صرف و نحو،علم حدیث ، علم فقہ ، علم تجوید ، علم تفسیر اور دوسرے علوم مفیدہ مثلاً ریاضی ، الجبرا ، جیومیٹری ، فلکیات ، کیمیا ، سماجی علوم میں جغرافیہ ، تاریخ ، سوانح اور طب اسی مرکزی نقطے کے گرد گھومتے رہے - فنون لطیفہ میں خطاطی ، مصوری ، کوزہ گری اور فن تعمیر

بھی قومی اور فوجی ضرورتوں کے تحت ترقی کرتے رہے ۔ کھیلوں میں نیزہ بازی ، شاہسواری وغیرہ فوجی ورزشیں بھی ضرورت کے تحت ترقی پاتی رہیں ۔ صنعت اور فنون حرب بھی اسی مرکز سے متعلق رہے اور اس مذہبی نسبت سے حلال و حرام کے پابند ہوئے ۔ تعلیم کا دائرہ تلاش خیر اور انسان کو انسان بنانے پر مبنی تھا ۔ روحانی اور اخلاقی قدروں کا مرکزی درجہ تھا اور جس شاخ علم یا شاخ فن کی زد اخلاقی اقدار پر پڑتی تھی وہ ترجیحات میں آخری سطح پر چلے جاتے تھے یا زیادہ منفی ہونے کی صورت میں انہیں بالکل ترک کر دیا جاتا تھا ۔ سماجی ترقی کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے زندگی پیچیدہ ہوتی گئی ، ان علوم کی تفصیلات بھی وضع ہوتی گئیں ۔ خصوصاً جب عالم اسلام کو یونانی فلسفہ سے سابقہ پڑا ، تصادم کی کیفیت رونما ہوئی ۔ مسلمانوں نے اول یونانی فلسفے کو ہضم کرنے کی کوشش کی پھر امتزاجی عمل کے ذریعے رد و قبول شروع ہوا ۔ کچھ عرصے کے بعد یونانی فلسفے کے منفی پہلو رد ہو گئے ۔ مابعدالطبیعاتی مسائل اہم ہوئے تو منطق استقرائی اور منطق استخراجی سے کام لے کر یونانی افکار کی تردید علم کلام کے ذریعے کی گئی ۔ یونانی افکار اور مسلمانوں کے افکار میں یہ کشمکش نئے علوم کی بعض نئی شاخوں کا باعث بنی ۔ اسلامی افکار کی نئی تعبیر و تشریح ہوئی اور نظام تعلیم میں معقولات کو جگہ دی گئی ، اس کی تہہ میں اسلامی فکری وحدت برقرار رکھ کر یونانی علوم کے سیکولر ازم کو ترک کر دیا گیا ۔ تاویل ، تشریح ، امتزاج اور دفاع کی کئی شکلوں نے جنم لیا ۔ اس عمل میں تعلیم کے انسانی پہلو ابھرے ۔ آزادی فکر کی اس روش نے علوم و فنون کی ترقی کے لیے نئی راہ ہموار کی ۔ عباسی خلفا کے دربار ، علوم و فنون کی ترقی اور دنیاداری کی مقبولیت کے مراکز تھے ۔ عباسی دور ہی میں علوم و فنون کے دینی رشتے کسی قدر کمزور پڑتے گئے ۔ اسلام میں موسیقی ریاضی کی شاخ تھی، اب عیش و عشرت سے منسوب ہوئی ۔ علوم کو اکائی ماننے کی وجہ سے علوم و فنون کے باہمی رشتے نئی نئی تعبیروں کا سبب ہوئے ۔ طب ، علم الابدان اور نفسیات سے متعلق ہوئی ۔ علم کلام نے فلسفہ ، منطق اور مذہب کے امتزاج سے نئی شکل اختیار کی ۔ مصوری نے جیومیٹری اور گل کاری سے رشتہ جوڑا ۔ فن تعمیر نے مساحت سے چل کر جمالیات سے ناتا استوار کیا ۔ غرض امتزاجی رویے نے سماجی علوم ، سائنس ، ادب اور فنون لطیفہ سب میں وحدت کا وجود کسی حد تک برقرار رکھا ۔ درباری عیش و عشرت کی وجہ سے آخر میں یہ دینی رشتہ کم ہو گیا تو دنیاداری نے قبضہ جمانا شروع کیا ۔

منگولوں کے حملے کے بعد عالم اسلام میں منفی رجحانات شدت سے ابھرے ۔ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا ، فکر و نظر کے چشمے سوکھ گئے ۔ زوال نے علم کی وحدت کو نقصان پہنچایا ۔ اصل حقائق کی جگہ فلسفہ کی موشگافیاں بڑھ گئیں ۔ دین آہستہ آہستہ عام معاشرتی زندگی سے

غائب ہوتا گیا ۔ نصاب میں بھی دینی کتب کے اصل متن کم ہوئے، قرآن کی جگہ تمرینی طرز کی کتابوں نے لے لی ۔ دین صوفیا کی محفلوں اور مساجد میں سمٹ کر رہ گیا ۔ صوفیاء کے حلقوں میں بھی دنیا خارج رہی ۔ ترک دنیا، قناعت اور تقدیر پرستی پر زور تھا، ظاہر و باطن الگ ہو گئے ۔ اس حالت میں برصغیر میں جو نصاب تعلیم رائج ہوا اس میں دینی علوم کی بجائے زبان و بیان پر زیادہ زور صرف ہوا ۔ وقت کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی ہر دو زبانیں مقامی باشندوں کے لیے بدیسی بنتی گئیں اس لیے زبان کی تدریس میں گرائمر زیادہ اہم ہوئی ۔ درسی کتابوں میں زمانہ ماضی کے اصل اور فرضی مسائل اور معاملات تھے جن کا رشتہ معاصر زندگی سے نہ تھا ۔ اکبری الحاد کے خلاف مذہب نے اپنا دفاع کیا تو اس بنا پر علم حدیث اور سیرت کو تقویت ملی لیکن نصاب کا غالب حصہ پھر بھی منطق اور فلسفہ پر مشتمل تھا ۔ نصاب میں دینی کتب صرف تین رہ گئی تھیں، تفسیروں میں بھی دو ڈھائی پارے نصاب کا حصہ تھے ۔ ۱۸ویں صدی میں ملا نظام الدین اور شاہ ولی اللہ کے گھرانے نے دینی ادارے قائم کر کے تعلیم میں کچھ تبدیلی کی ۔ درس نظامیہ کی تدریس کا آغاز ہوا تو اس میں بھی زیادہ زور مابعد الطبیعیاتی مسائل پر تھا ۔ شاہ ولی اللہ کے خانوادے نے البتہ معاشرتی زندگی سے تعلق رکھنے کی کوشش ضرور کی لیکن نظام تعلیم میں یہ تبدیلی زیادہ دور تک نہیں جا سکی ۔

اس پس منظر میں تعلیم میں درجہ بندی کچھ اس طرح تھی :

الف ۔ قرآن اور حدیث کی حیثیت مرکزی تھی ۔

ب ۔ دوسرے نمبر پر تاریخ، سائنس اور جملہ سماجی علوم تھے ۔

ج ۔ علوم میں مزید درجہ بندیاں فوجی اور سیاسی ضرورتوں کے تحت ہوئیں ۔ مارشل علوم کی ترقی زیادہ ہوئی ۔ فنون لطیفہ میں صرف وہ علوم زیادہ اہم رہے جو کسی نہ کسی طرح مذہب یا فوجی ضرورتوں سے مربوط تھے ۔ اسی لیے بت تراشی کو سب سے کم اہمیت تھی کیونکہ نہ اس کی کوئی افادی حیثیت تھی نہ مذہبی نہ سماجی ۔

(۹)

عصر حاضر میں سائنس نے بہت اہمیت پائی ہے ۔ کوئی ملک بھی دفاعی ضرورتوں سے غافل نہیں ہو سکتا تاہم ساری قوم کو سائنس دان بنانے کی مہم غیر فطری ہے ۔ پاکستان پس ماندہ ممالک میں شامل ہے ۔ اس کے مالی وسائل محدود ہیں، اس لیے وہ سائنس کی دوڑ میں ان ملکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو مالی طور پر مستحکم ہیں ۔ ہمیں سوچنا پڑے گا کہ ہماری ضرورت کے اعتبار سے کتنی افرادی قوت ہمیں اس محاذ کے لیے تیار کرنی ہے ۔ ضرورتوں کی

منصوبہ بندی کر کے سائنس سیکٹر کو کسی حد تک محدود کرنا پڑے گا ۔ اسی طرح مخصوص نصب العین کی مدد سے جملہ علوم کو ایک وحدت میں پرو کر ہمیں اپنا تشخص علوم کے حوالے سے برقرار رکھنا ہو گا ۔ یہ صحیح ہے کہ ادب " تلاش روزگار " میں زیادہ مفید نہیں اور ہماری ترجیحات میں اس کا گراف بہت نیچے چلا گیا ہے لیکن ادب اور سماجی علوم نے بالواسطہ طور پر ماضی میں کردار سازی کا فریضہ ادا کیا ہے ۔ اس سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے ۔ چند نکات غور چاہتے ہیں :

۱ ۔ سارے علوم و فنون دینیات نہیں بنائے جا سکتے اور نہ عالم اسلام میں یہ کبھی ہوا ہے ۔ اسلامیات کا تحقیقی مطالعہ ماہرین کا کام ہے یا پھر اسلامیات کے نصاب ہی میں اس کی اساسی اہمیت ہو سکتی ہے ۔ باقی علوم و فنون دینی رجحان کے تابع تو ضرور رہیں گے لیکن انہیں کاملاً دینی نہیں بنایا جا سکتا۔

۲ ۔ خود اسلامیات کا موجودہ نصاب نظرثانی چاہتا ہے ۔ اس میں قرآنی متن کو مرکزی اہمیت حاصل ہونی چاہئے ، جو اس وقت نہیں ۔ اسلامیات میں علوم قرآنیہ کو زیادہ جگہ دینی ہو گی اور عربی زبان بھی اس مضمون کے طالب علموں کے لیے لازم قرار پائے گی یا شعبہ عربی اور اسلامیات کو ایک شعبہ بنانا ہو گا ۔

۳ ۔ زبانوں کی تدریس میں بھی یہ خیال رکھنا ہو گا کہ ہمارے دو مقصد ہیں ۔ ایک جدید زبانوں سے آشنائی اور دوسرے قدیم ورثے کی بازیافت ۔ یہاں بھی عربی اور فارسی کی اہمیت کو یقیناً دوسری زبانوں پر فوقیت دینی پڑے گی اور ان کے نصابات کو قومی اور ملی ضرورتوں کے مطابق دوبارہ تشکیل دینا ہو گا ۔

۴ ۔ پورے نظام تعلیم میں مختلف مضامین کی درجہ بندی لازم ہے ، لیکن اس اضافے کے ساتھ کہ نہ سارے مضامین کو دینیات بنایا جا سکتا ہے نہ مختلف زبانوں پر اتنا اصرار ہو سکتا کہ طالب علم محض زبانوں کی تدریس میں اپنے آپ کو ختم کر دیں ۔ پھر یہ بھی ہے کہ سائنس کو ڈنڈے کے زور سے نافذ کرنا ممکن نہیں ۔ ہم نے محض سائنس پر زور دے کر تربیت اور اخلاقیات کو معاشرے سے نکال دیا ہے جس سے نفع پسندی کے غیر معمولی رجحانات نمودار ہوئے ہیں اور معاشرتی زندگی آج انتشار کا شکار ہے ۔

۵ ۔ توازن کا وہ اسلامی اصول برقرار اور بحال کرنا ہو گا جسے ہم نے مغرب پرستی میں خیرباد کہہ دیا تھا ۔ اس کے بغیر معاشرتی زندگی میں ثبات ممکن نہیں ۔

اقبال کا تصور تعلیم اور عصری صورت حال

(۱۰)

علامہ اقبال کی رائے میں تاریخ قوموں کا ذہن ہوتی ہے ۔ اگر کوئی قوم اپنا حافظہ بھلا دے تو وہ مردہ ہو جاتی ہے ۔ اس لیے میرے خیال میں کالج کی سطح پر (کم از کم ایف ۔ اے تک) تاریخ کو لازمی مضمون کی حیثیت حاصل ہونی چاہئے ۔

تاریخ کی اہمیت علامہ نے "مثنوی اسرار و رموز" میں کھل کر بیان کی ہے اور اسے مسلمانوں کے جملہ علوم میں سب سے زیادہ ضروری قرار دیا ہے ۔ ان کی رائے میں حال کا ماضی سے گہرا رشتہ ہے ۔ ماضی ، حال اور مستقبل ایک وحدت ہیں ۔ حیات لازوال کا حصول ماضی ، حال اور مستقبل کو یکجا کر کے ہی ممکن ہے ۔ زندگی میں ماضی کے تجربات کی تکرار نہیں ہوتی لیکن خود آگاہی کے لیے ضروری ہے کہ انسان ماضی کے شعور سے فائدہ اٹھائے ۔ یہی تاریخ کے مضمون کا مدعا ہے ۔

علامہ نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ تاریخ کا مطالعہ مسلمان طالب علم کے لیے لازمی ہو ۔ ان کا مطالبہ یہ بھی تھا کہ انجمن حمایت اسلام تاریخ کے لیے اعلیٰ سطح کی ریسرچ کا ادارہ بھی قائم کرے ۔

۱۹۳۲ء میں علامہ نے اسی مضمون کی خاطر ایک نصابی جھگڑے میں بھرپور شرکت کی ۔ پروفیسر جے ۔ ایف بروس تاریخ کے استاد بنے تو انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کی ہندو اکثریت کے پیش نظر سینٹ میں یہ تجویز پیش کی کہ تاریخ اسلام بی ۔ اے پاس کورس سے خارج کر دی جائے ۔ یہ تجویز ایک ووٹ سے منظور بھی ہو گئی ۔ مسلمانان پنجاب نے مزاحمت کے لیے کئی جلسے کئے ۔

علامہ اقبال نے ۱۱ جون ۱۹۳۲ء کو موچی دروازے کے باہر جلسے کی صدارت کرتے ہوئے یہ بتایا کہ غالباً ۱۹۲۳ء کو تاریخ اسلام بی ۔ اے کے نصاب میں شامل کیا گیا ۔ ان کی یہ رائے صحیح ہے کہ ۱۹۲۳ء میں یونیورسٹی نے اس مضمون کا فیصلہ کیا ' لیکن ہر فیصلہ چونکہ ۲ سال بعد امتحان کا حصہ بنتا ہے ' اس لیے ۱۹۲۵ء کے امتحان کے لیے یہ مضمون داخل نصاب ہوا تھا۔

اس سے پہلے تاریخ اسلام نصاب کا حصہ نہ تھی ۔ ۱۹۳۲ء میں بی ۔ اے پاس کورس میں تاریخ ہند کا پہلا پرچہ تو لازمی تھا ، دوسرے پرچے میں تین مضمونوں میں سے ایک لیا جا سکتا تھا ؟ تاریخ انگلستان ، تاریخ یورپ یا تاریخ یونان و روما میں سے ایک دور ۔ اسی

طرح آنرز میں پہلا پرچہ تاریخ ہند کا ابتدائی دور لازمی تھا، دوسرے پرچے میں سیاسیات یا تاریخ یا جغرافیہ میں سے ایک لیا جا سکتا تھا۔

یہی صورت کم و بیش اگلے برسوں میں بھی تھی، اس فرق کے ساتھ کہ کبھی پاس کورس کے دوسرے پرچے میں صرف تاریخ یونان، کبھی روم ادل بدل کر رکھے جاتے تھے۔ اسی طرح آنرز میں جغرافیہ کا کوئی سا موضوع لازمی تھا۔ جب تاریخ اسلام داخل نصاب ہوئی تو اس کا عنوان تھا "تاریخ اسلام کا عمومی خاکہ" اس میں رسول پاک کے زمانے سے لے کر خلفائے عباسی کے دور عروج تک کا زمانہ شامل تھا۔ دوسرے پاس کورس میں دوسرے پرچے کا آپشنل، تاریخ انگلستان یا تاریخ یورپ یا تاریخ روم یا یونان نصاب کا حصہ قرار پائے تھے۔

یہ صورت حال دو لحاظ سے غور طلب ہے۔ ایک تو یہ کہ تاریخ اسلام چار مضامین کے آپشنل حصے میں تھی، یعنی تاریخ کے طالب علم چار حصوں میں بٹ جاتے تھے۔ اس طرح طلبہ کی تھوڑی تعداد تاریخ اسلام پڑھتی ہو گی۔ یعنی مسلمان بھی سارے یہ مضمون نہ لیتے ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہو گئی تھی۔ ۱۹۳۲ء تک یہ آپشن سب سے زیادہ مقبول ہو گئی ہو گی اور باقی ملکوں کی تواریخ پس منظر میں چلی گئیں ورنہ پاس کورس کے نصاب سے خارج کرنے کا کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ علامہ اقبال نے بھی پاس کورس میں طلباء کی زیادہ تعداد کے تاریخ اسلام لینے کا تذکرہ کیا ہے اور اسی کو خارج کرنے کا سبب قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ "عقل انسانی جب شرارت پر آ جائے تو وہ اپنے اندرونی جذبات و حرکات سے کام لے کر اپنے مقاصد کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے"۔

دوسری بات یہ ہے کہ غالباً بروس کو اسلام کا ابتدائی دور کھٹک رہا تھا اور عباسی دور یا منگولوں کے بعد کا دور اس لحاظ سے بے ضرر تھا کہ اس سے مسلمانوں کا سیکولر اسلوب حیات ظاہر ہو رہا تھا۔ ایم اے کے پرچے کو گوارا کرنے کا شاید یہی سبب تھا۔

مسٹر بروس کی رپورٹ پر علامہ نے مفصل بحث کی ہے۔ بقول علامہ بروس کا استدلال یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو ہندوستان کی تاریخ پڑھنی چاہئے، علامہ کا اعتراض اس حوالے سے نامکمل ہے کہ انہوں نے اس بات کو پیش نظر نہیں رکھا کہ پروفیسر بروس برطانوی دور کی تاریخ ہند کے مخالف نہیں تھے۔ ہندوستان کی تاریخ داخل نصاب تھی اور لازمی پرچہ بھی۔ دوسرے پرچے میں تاریخ انگلستان، تاریخ یورپ اور تاریخ روم بھی شامل تھیں اور ایک عرصے سے پڑھائی جا رہی تھیں۔ اس لیے ہندوستان کے لوگ تاریخ ہندوستان کے علاوہ پاس کورس میں دوسرے ملکوں کی تاریخ بھی پڑھ رہے تھے، حتیٰ کہ آنرز میں بھی

انگلستان کی آئینی تاریخ ، انگلستان کی سیاسی تاریخ ، تاریخ یورپ اور تاریخ دنیا بدستور داخل نصاب تھیں اور ہمیشہ رہیں ۔ اس لیے پروفیسر بروس کے استدلال کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر بروس جھوٹ سے کام لے رہے تھے ۔ علامہ اقبال نے پروفیسر بروس کے دعوے کو غلط قرار دیا ہے کہ " ہندوستان کے لوگوں کو صرف تاریخ ہند پڑھنی چاہئے " ان کے بیان کے مطابق " یہ دعوی غلط ہے کہ کسی قوم کی تاریخ کو اس قوم کی تاریخ نہ سمجھا جائے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ اجتماعی حیثیت سے انسانی روح کی ایک حرکت ہے ، روح کا کوئی ماحول نہیں بلکہ تمام عالم اس کا ماحول ہے ، اگر اسے کسی قوم کی ملکیت سمجھا جائے تو یہ تنگ نظری کا ثبوت ہے "

علامہ کا استدلال شاید اس بنا پر یہ ہے کہ قرآن میں دیگر اقوام کے حالات بھی بیان ہوئے اور ان کے عروج و زوال کا پس منظر بیان کیا گیا ہے ۔ علامہ غالبا تاریخ اسلام ہی نہیں دیگر ممالک کی تاریخ بھی پڑھانے کے قائل تھے لیکن ان کے ہاں اولیں حیثیت تاریخ اسلام ہی کو حاصل تھی۔

مسلمانان ہند کی مخالفت کے نتیجے میں تاریخ اسلام بی ۔ اے پاس کورس کے پرچے میں بدستور آپشنل رہا ، بلکہ کیلنڈر ۲۹ ۔ ۱۹۲۸ ء سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنرز کے نصاب میں بھی تاریخ اسلام شامل تھی ، یعنی ۱۹۲۵ء ہی سے ایم ۔ اے کے نصاب میں ایک آپشنل پرچہ عباسی دور کی اسلامی تاریخ بھی تھا ۔

ایک بات اور غور طلب ہے کہ اسلامی تاریخ کے لیے صرف وہ نصابی کتب داخل نصاب تھیں جو مستشرقین نے لکھیں اور جن کی مخالفت علامہ نے ہمیشہ اس بنا پر کی تھی کہ مستشرقین اپنی مرضی کے نتائج نکالتے ہیں ۔

علامہ نے یہ کوشش بھی کی کہ مسلمان اپنے طور پر تاریخ میں اعلی تحقیق کے لیے اپنے ادارے قائم کریں ۔ انجمن حمایت اسلام کے علاوہ علامہ دوسری قدیم و جدید درس گاہوں میں بھی تاریخ اسلام کو شامل نصاب کر کے اسے مسلمانوں کی تعلیم کا ضروری حصہ بنانا چاہتے تھے چنانچہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے اسی جلسہ میں انہوں نے مشورہ دیا :

> " اسلامی ممالک کی مجموعی آبادی ہندوستان کے مسلمانوں کے قریباً مساوی ہو گی ۔ پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم اس شعبے کی تدوین و تحقیق اور ترتیب و تنظیم پر متوجہ ہوں ۔ انجمن حمایت اسلام کو چاہئے کہ ایسے ادارے کا افتتاح کرے جہاں تاریخ اسلامی کی تعلیم کا بہترین بندوبست ہو ۔ لیکن انجمن تنہا اس کام کو انجام نہ دے سکے گی بلکہ آپ لوگوں کی امداد کی ضرورت ہے ۔ کچھ

عرصے سے انجمن مسلمانوں کے مفاد سے غافل اوران کے جذبات سے نا آشنا ہے اور بعض غرض مند ہاتھوں میں ایک کھلونا بنی ہوئی ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ آزاد طبع اصحاب کو خدمت کا موقع دیا جائے تاکہ کسی کو کوئی شکایت نہ رہے "
(گفتار اقبال ۔ ص ۱۵)

اسی اجلاس میں متفقہ طور پر قرار داد منظور کی گئی جو یہ تھی :

" مسلمانان لاہور کا یہ جلسہ ہندوستان کی تمام جدید و قدیم اسلامی درس گاہوں مثلاً مدرسہ عالیہ دیوبند اور سہارنپور و لکھنؤ وغیرہ کی تاریخ اسلامی کو تعلیم و ترویج کی طرف توجہ دلاتا ہے ۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مروجہ نصاب میں ترمیم کی جائے اور تاریخ اسلامی کو مسلمانوں کی تعلیم کا جزو لاینفک قرار دیا جائے "

علامہ اقبال الگ یونیورسٹی کا تصور بھی پیش کرتے ہیں فرماتے ہیں :

" ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قائم ہونا ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے ۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علماء اور واعظ انجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں ، اس لیے کہ ان کا مبلغ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے ۔ اخلاق اور مذہب کے اصول و فروع کی تلقین کے لیے موجودہ زمانے کے واعظ کو تاریخ ، اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لڑیچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہئے ۔ الندوہ ، علی گڑھ کالج ، مدرسہ دیوبند اور اس قسم کے دوسرے مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں اس بڑی ضرورت کو رفع کر نہیں سکتے ، ان تمام بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دارالعلم ہونا چاہئے جہاں افراد قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشو و نما دینے کا موقع حاصل کر سکیں بلکہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ تیار کیا جا سکے جس میں زمانہ موجودہ کے ہندوستانی مسلمانوں کو ڈھالنا چاہئے ، پس یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی دارالعلم قائم کیا جائے جس کی مسند نشیں اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب دل کش انداز سے ہوئی ہو ۔ اس قسم کی تصویر مثالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے ، اس کے

لیے اعلیٰ تخیل ، زمانے کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کو تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے "

اسی طرح علامہ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اسلامی تعلیم کے خصوصی نصاب پر بحث کرتے ہوئے اہم مشورے دیئے ۔ خاص طور پر قدیم طرز کے مدرسوں کے طالب علموں کو علوم جدیدہ سے واقف کرنے کے لیے ان کی تجاویز بہت اہم ہیں ، فرماتے ہیں :

" مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ کے مسلم دینیات کے مجوزہ نصاب سے اتفاق نہیں کر سکتا ۔ میرے نزدیک قدیم طرز پر مسلم دینیات کا شعبہ قائم کرنا بالکل بے سود ہے ۔ اگر اس سے آپ کا یہ مقصد نہیں ہے کہ سوسائٹی کی زیادہ قدامت پسند جماعت کی تالیف قلب مد نظر رہے ۔ جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے ، کہا جا سکتا ہے کہ قدیم تر دینیات فرسودہ خیالات کی حامل ہے اور جہاں تک تعلیمی حیثیت کا تعلق ہے جدید مسائل کے طلوع اور قدیم مسائل کی طرح نو کے مقابلے میں اس کی کوئی قدر وقیمت نہیں ---- میں آپ کی اس تجویز سے پورے طور پر متفق ہوں کہ دیوبند اور لکھنؤ کے بہترین مواد کو بر سرکار لانے کی کوئی سبیل نکالی جائے ۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو انٹرمیڈیٹ تک تعلیم دینے کے بعد کیا کریں گے ؟ کیا آپ ان کو بی ۔ اے اور ایم ۔ اے بنائیں گے ؟ --- میں یہاں ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں ، آپ ندوہ اور دیوبند کے لوگوں کو انٹرمیڈیٹ کے معیار تک پہنچانا چاہتے ہیں ، میں چاہتا ہوں کہ وہ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کرنے پر مجبور کئے جائیں ۔ یہاں وہ سوائے انگریزی کے کوئی دوسری زبان اختیار نہ کر سکیں گے ۔ دوسرے مضامین میں وہ حسب ذیل مضامین سے انتخاب کر سکیں گے ۔

(الف) علوم طبعی (ب) ریاضیات (ج) فلسفہ (د) اقتصادیات "

علامہ کی یہ تجاویز دینی مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات کو جدید علوم سے آشنا کرنے کے لیے تھی جو تکمیل تک نہ پہنچ پائی اور آخر انہوں نے نیاز الدین کی تجویز پر پٹھان کوٹ میں ایک ادارہ قائم کرنے سے اتفاق کیا تاکہ فقہ اسلامی کی تدوین نو ممکن ہو جائے ۔ علامہ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں کی ضرورت کا بھی احساس رکھتے تھے ۔ خاص طور پر ان کے سامنے جاپان کی مثال تھی جہاں صنعتی تعلیم انقلاب برپا کر رہی تھی ۔ وہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے اسی قسم کی تعلیم پر زور دیتے ہیں ۔

عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ علامہ عورتوں کی تعلیم اور حقوق کے سلسلے میں تنگ نظر تھے ۔ اس کی تردید علامہ کی وہ تقریر کرتی ہے جو انہوں نے مسلم خواتین کے سپاس نامے کے جواب کی تھی ۔ اس سے کئی برس پہلے بھی انہوں نے حقوق نسواں ، پردے کا مسئلہ ، تعدد ازدواج اور عورتوں کی تعلیم پر خاص طور پر زور دیا تھا ۔

عورتوں کے بارے میں علامہ کے جو اشعار اردو میں ملتے ہیں ان سے حقوق نسواں کی یک طرفہ تصویر بنتی ہے ۔ جو حقیقت پر مبنی نہیں ۔اس کے ساتھ علامہ کے فارسی کلام اور اردو انگریزی نثر کو بھی دیکھنا ضروری ہے ۔

آزادی نسواں کو علامہ یورپ کی طرح " مادر پدر آزادی " بنانا نہیں چاہتے ۔ ان کی رائے میں عورت کے لیے اخلاقی پابندیوں کا برقرار رہنا ضروری ہے ۔ اس کے ساتھ اصلاح تمدن اور تعلیم عام کی ضرورت پر انہوں نے ہمیشہ زور دیا اور زندگی میں انقلاب آ جانے کی وجہ سے بعض تمدنی ضرورتوں کو اہم قرار دے کر شریعت اسلامی کے ان حصوں کو حذف کرنے پر زور دیا جو قدیم تمدنی زندگی کی وجہ سے مسلمانوں میں در آئے تھے ۔ ان کی رائے میں :

> " مسلمات مذہب میں کوئی اندرونی نقص نہیں ہے ، بلکہ قرآن شریف اور حدیث کے وسیع اصول کی بنا پر جو استدلال فقہا نے وقتاً فوقتاً کیا ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ خاص خاص زمانوں کے لیے واقعی مناسب اور قابل عمل ہیں مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں ہیں "

عورتوں کی تعلیم کے لیے آئیڈیل حضرت فاطمۃ الزہرا ہیں ۔ علامہ کی رائے میں "کامل عورت بننا ہو تو آپ کو حضرت فاطمۃ الزہرا کی زندگی پر غور کرنا چاہئے اور ان کے نقش پر چلنے کی سعی کرنی چاہئے ۔"

مذکورہ بالا ایڈریس میں حقوق نسواں پر بہت زور دیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ " اسلام مرد و زن میں قطعی مساوات کا قائل ہے ، آیات قرآنی میں جہاں علماء نے مرد کی فوقیت کا نتیجہ نکالا ہے ، علامہ اقبال اسے تسلیم نہیں کرتے ۔ ان کی رائے ہے کہ " عربی محاورے کی رو سے اس کی یہ تعبیر صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے ۔ عربی گرائمر کی رو سے قائم کا صلہ جب علیٰ پر آئے گا تو معنی محافظت ہو جاتے ہیں "

مرد عورت کا " محافظ " ہے لیکن "کئی لحاظ سے مرد و عورت میں کسی قسم کا فرق نہیں ۔ " علامہ نے اسلام کی ابتدائی تاریخ سے مثالیں دی ہیں کہ کس طرح عورتوں نے جہاد میں حصہ لیا۔حضرت عائشہ دینی درس دیتی تھیں ۔ خلفائے عباسیہ کے دور میں ایک موقع پر خلیفہ کی بہن قاضی القضاہ مقرر ہوئیں اور فتوی صادر کرتی رہیں۔" علامہ عورتوں کو ووٹ کا حق دینے کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے لیے " خلافت اسلامیہ میں خلیفہ کے انتخاب پر ہر شخص کو رائے دینے " کا تذکرہ کیا ہے ۔ یہ ضروری شرط انہوں نے ہر جگہ بیان کی ہے کہ اسلامی معاملات میں اعتدال مد نظر رکھنا ضروری ہے ۔ ہاں البتہ ان کی رائے میں تمدنی لحاظ سے مردوں اور عورتوں کے فرائض مختلف ہیں ۔فرماتے ہیں :

" یہ فرائض بعض تو خدائی احکام کی رو سے ہیں اور بعض خود وضع کردہ ہیں , بعض فطری طور پر ہیں ۔ عورت کے بحیثیت عورت , مرد کے بحیثیت مرد بعض خاص علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں ۔ ان فرائض میں اختلاف ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنی اور مرد اعلیٰ ہے ۔ فرائض کا اختلاف اور وجوہ پر مبنی ہے ----- تمدنی ضروریات کی وجہ سے فرائض میں اختلاف ہے ۔ تمدنی زندگی کے لیے جو احکام ہوں گے وہ فرائض کو مد نظر رکھتے ہوئے ہوں گے ،،

امت مسلمہ میں عورت کی تعلیم اس لیے ضروری ہے کہ مرد کی تعلیم فرد واحد کی تعلیم ہے اور عورت کی تعلیم پورے معاشرے کی تعلیم ہے ۔ علامہ عورت کے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے حامی ہیں لیکن فرائض کی علیحدگی کی وجہ سے عورتوں اور مردوں کی تعلیم الگ الگ اور مضامین کی درجہ بندی مختلف چاہتے ہیں ۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے علامہ نے جدا نصاب کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے ۔ فرماتے ہیں:

" قومی ہستی کی مسلسل بقا کے لیے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتدا میں ٹھیٹ مذہبی تعلیم دیں ۔ جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں تو انہیں اسلامی تاریخ , علم تدبیر , خانہ داری اور علم اصول حفظ صحت پڑھایا جائے "

علامہ کی نظر میں عورت کا اولین فرض اولاد کی تربیت ہے اس لیے " امومت کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لیے اور گھربار کی دیکھ بھال کے لیے وہ عورتوں کی تعلیم کا خاص اہتمام چاہتے ہیں ۔ اس نصاب تعلیم میں بقول علامہ " وہ مضامین جو نسائیت کی

نفی کرنے یا اسلام کی حلقہ بگوشی سے انہیں آزاد کرانے والے ہوں بہ احتیاط ان کے نصاب تعلیم سے خارج کر دیئے جائیں "

مسلمان لڑکیوں کے تعلیمی نصاب میں وہ جغرافیہ کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں ,فرماتے ہیں : " ----- لڑکیوں کے لیے جو اسلامیہ سکول اس وقت موجود ہیں یا آئندہ بنائے جائیں ان میں ----- جغرافیہ کی ترویج نہایت ضروری ہے ۔"

ان نصابی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے الگ یونیورسٹی کے قیام کی تجویز بھی پیش کرتے ہیں ۔ انہوں نے انجمن حمایت اسلام کا صدر ہونے پر مفصل بیان دیا ۔ فرماتے ہیں :

دوسرا امر جو آپ کی فوری توجہ کا محتاج ہے وہ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم ہے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کا متوسط طبقہ اب کافی بیدار ہو چکا ہے اور اس بات کا مطالبہ کر رہا ہے کہ ان کی اولاد کی صحیح اسلامی اصول کے مطابق تعلیم و تربیت کی جائے ۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ انجمن حمایت اسلام فی الحال مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اپنا نصاب تجویز کرے اور مجوزہ نصاب کے مطابق ان کا سالانہ امتحان لے کر خود ہی سندات تقسیم کرے ۔ جہاں تک لڑکیوں کی تعلیم کا تعلق ہے فی الحال آپ صرف ایک امتحان لینے والے ادارے کے طور پر کام شروع کریں اور رفتہ رفتہ اس ادارے کو مسلمان عورتوں کی ایک آزاد یونیورسٹی کی صورت میں منتقل کر دیں بلکہ آپ کا مجوزہ انڈسٹریل گرلز سکول بھی اسی یونیورسٹی کی ایک شاخ قرار پائے "

(۱۲)

درس و تدریس میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ بھی علامہ کی توجہ کا مرکز رہا ۔ اس موضوع کے ذریعے ہم علامہ کے تصورات تعلیم کے آخری حصے پر آ جاتے ہیں ۔

زبان کے بارے میں علامہ کا موقف بہت واضح تھا , فرماتے ہیں :

" زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں ۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے ۔"

اقبال کا تصور تعلیم اور عصری صورت حال

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام ۹ ستمبر ۱۹۳۷ء کو فرماتے ہیں :

" اردو زبان کے لیے جو کوشش آپ کر رہے ہیں ان کے لیے مسلمانوں کی آئندہ نسلیں آپ کی شکر گزار ہوں گی "

۲۷ ستمبر ۱۹۳۷ء کو انہی کے نام خط لکھتے ہیں :

" یقین جانیئے کہ اس معاملے (اردو) میں کلیتہً آپ کے ساتھ ہوں ۔ اگرچہ اردو زبان کی بہ حیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں "

اردو زبان ۱۹۰۵ء کے بعد مسلمانوں کے ملی تشخص اور سیاسی نصب العین کا لازمی جز بن کر ابھری تھی ، اس لیے علامہ اس کی حمایت میں شدت کے ساتھ کمربستہ رہے ۔ انہوں نے اس معاملے کو ایک حیاتیاتی (Biological Factor) کے طور پر اختیار کیا ۔ وہ اسے " عصبیت " کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اظہار کا وسیلہ " قرار دیتے ہیں ۔ مسلمانوں کی سماجی تاریخ کے حوالے سے یہ حقیقت واضح ہے کہ عربی مسلمانوں کے لیے مذہبی زبان کے طور پر اہمیت رکھتی ہے ، تمدنی سطح پر فارسی نے ثقافتی عمل کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا ۔ قرون وسطیٰ میں عالم اسلام کی سرکاری اور درباری زبان فارسی ہی تھی ۔ اسے ثقافتی سطح پر برتری مل چکی تھی ۔ عربی کو پہلا اور فارسی کو دوسرا درجہ ملا تھا ۔ مسلمان جس جس ملک میں گئے وہاں کی مقامی زبان کو انہوں نے تیسرا درجہ دیا ۔ تبلیغی سرگرمیوں میں مقامی بولیاں بھی کام آئیں ۔ چوتھے نمبر پر انہیں جگہ دی گئی ۔ سماجی قوتوں کے عمل میں زبانوں کی یہ درجہ بندی ہر اسلامی ملک میں برابر قائم رہی ۔

علامہ نے برصغیر میں مسلمانوں کے لیے اردو اختیار کرنے کی دعوت دی تو یہ اسی تمدنی عنصر کی وجہ سے ہے جہاں زبان کسی " مادری پدری " تعصب سے آلودہ نہیں تھی ۔ اردو زبان برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اظہار کا ایک فطری وسیلہ تھی ۔ برصغیر میں صدیوں کے لسانی عمل میں فارسی کی ثقافتی برتری مسلسل رہی کہ اسے سرکاری اور درباری تحفظ حاصل تھا لیکن مقامی زبانوں کی ترقی کے عمل سے سماجی زندگی میں اردو نے اپنا دائرہ سرکاری سرپرستی کے بغیر ہی وسیع کر لیا اور دوسری بولیوں پر فوقیت حاصل کی ۔ آخر اردو عملاً اظہار کا ناگزیر علمی و ادبی وسیلہ بن گئی اور مسلمانوں کی کئی ہزار سال کی تمدنی سرگزشت میں شامل ہوئی ۔ اردو کی یہ ترقی پذیری کسی لسانی تعصب کا سبب نہیں تھی ۔ پورے برصغیر میں عربی اور فارسی کے بعد اردو کا تیسرا درجہ تسلیم کیا گیا ۔ دوسری ابھرنے والی مقامی

زبانوں نے مقامی ضروریات تک اپنے آپ کو محدود رکھا ۔ ان کے اردو سے ٹکراو کا کوئی واقعہ ۱۸۵۷ء تک عالم اسلام کی تاریخ میں نہیں ملتا ۔

برطانوی تسلط کے دور میں فارسی کا سماجی رتبہ انگریزی نے لیا ۔ مغربی تعلیم نے مذہب سے کوئی واسطہ نہ رکھا اور تربیت ماں باپ کی ذاتی ذمہ داری قرار پائی ۔ عربی ہمارے دائرہ فکر و عمل سے نکل گئی ، فارسی کو انگریزی نے مٹا دیا ۔ انگریزی کی برتری قائم ہوئی ۔ یہ اقدام مقامی روایات کی جگہ بدیسی روایات کو اختیار کرنے کا تاریخی جبر تھا ۔ اس سے فارسی عملی زندگی سے منہا ہوئی ، اس کی جگہ بدیسی زبان گملے میں لگا کر رائج کر دی گئی جس سے معاشرتی اور طبقاتی تضادات رونما ہوئے ۔ تاہم سماجی سطح پر از خود اردو کی نشو و نما کا عمل جاری رہا کہ اس نے مسلمانوں کی سماجی زندگی میں موثر عنصر کے طور پر شرکت کر رکھی تھی ۔

اس تناظر میں قومی جد و جہد آزادی میں انگریزی کی جگہ اردو کو سرکاری ذریعہ اظہار اور قومی اور سرکاری زبان بنانے کی خواہش فی الحقیقت بدیسی جبر کے خلاف موثر احتجاج تھی اور یہ عمل اردو کو تحریک پاکستان میں اہم عنصر کے طور پر اختیار کرنے پر منتج ہوا تھا ۔ علامہ کی زندگی میں ہندی اردو جھگڑے میں اردو زبان مسلمانوں کی تمدنی وراثت کی امین اور سیاسی عزائم کا ناگزیر حصہ ہو گئی تھی ۔ پاکستان کے لیے اردو کو سرکاری اور قومی زبان قرار دینے کا سبب اردو زبان کی وہ داخلی حرکی قوت بھی تھی جس کے بل بوتے پر یہ زبان مسلمانوں کی تہذیبی وراثت کہلاتی تھی ۔ مسلمانوں اور دیگر اقوام کی مشترکہ میراث ہونے کے باوجود اردو کا مزاج اور علمی و ادبی سرمایہ مسلمانوں کی کئی سو برس کی بود و باش کا ناگزیر حصہ بنا اور مقامی زبانوں کے مقابلے میں متوسط طبقے نے اس کو اپنے آئیڈیل کا درجہ دے دیا ۔

حصول پاکستان کے بعد کئی نئی تبدیلیاں آئیں ۔ ملک میں عدم استحکام نے بار بار مارشل لاء کو دعوت دی ، سیاسی عمل نے اخلاقی اقدار کو خیر باد کہا ۔ ملی عزائم اور حقیقی زندگی کے درمیان فاصلے بڑھے ، مرکز گریز طاقتوں نے علاقائی اور مقامی عصبیتوں کو ہوا دی ، بدیسی یلغار نے عقیدے اور عمل میں فاصلے بڑھا دیئے ۔ حکومت کی نوعیت نظریاتی ہو یا سیکولر ---- یہ سوال بار بار اٹھا کہ ذریعہ تعلیم کون سی زبان ہو ۔ معاشرے میں طبقاتی تضادات بڑھتے گئے ، یہ کشمکش کبھی شہری اور دیہاتی کے سوال کی صورت میں رونما ہوئی ، کبھی غریب اور امیر کے مفادات کا مسئلہ بنی ، کبھی مرکز اور صوبوں کے حقوق و اختیارات کی شکل میں سامنے آئی ، کبھی قوم اور قومیتوں کے فرق میں متشکل ہوئی اور کبھی اس نے

خالص لسانی سطح پر صوبوں کی تمدنی شناخت کا روپ دھارا ۔ مرکز گریز طاقتوں کی اس نبرد آزمائی میں ون یونٹ کا قیام اور پھر اسے رد کرنے کی جد وجہد ، لسانی مسائل کی مفاداتی حیثیت ----- یہ سارے معاملات ایک ہی بنیادی سمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں ، جس کے قابل عمل حل سے ہم نے ہمیشہ آنکھیں بند کیے رکھیں ۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کی علیحدگی کا سیاسی عمل اگر لسانی مسئلہ تھا تو پاکستان کی دو قومی زبانیں (اردو اور بنگلہ) بنا دینے کے بعد سارے جھگڑے ختم ہو جانا چاہئیں تھے ۔ مگر ایسا نہیں ہوا کیونکہ لسانی اختلاف تو اصل مرض نہ تھے یہ تو دوسرے امراض کی علامات تھے ۔ ہم علامتوں کے علاج میں لگے رہے اور اصل اسباب کی طرف سے غافل ہوتے چلے گئے ۔ آج بھی لسانی اختلافات اور لسانی عصبیتیں مرض کی علامات ہیں ۔ ضرورت تو اصل مرض کے علاج کی تھی ، علامتوں کے علاج کی نہیں ۔ سیاسی امراض کا علاج سیاسی اور لسانی کا لسانی ہوتا ہے ، ہم نے سیاسی مسائل کو لسانی امور کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہے ۔ مفادات کی " جنگ زرگری " میں بر سراقتدار طبقے (جو سرمایہ دار طبقہ ہے) کے مفادات کو اولین حیثیت تھی ۔ یہ طبقہ اردو کی بجائے انگریزی کا حامی ہے۔صوبائی سطح پر ہم ایک سے زیادہ زبانوں سے دو چار ہیں ۔ صوبہ سرحد میں مشرقی پشتو اور مغربی پشتو کے علاوہ ایک علاقہ ہندکو کا بھی ہے ۔ سندھ میں سندھی 'اردو' سرائیکی کے اپنے اپنے حلقے ہیں ، پنجاب میں لسانی طور پر پنجابی زبان کا نام اب صرف چند اضلاع تک رہتا نظر آتا ہے ، سرائیکی ، پوٹھوہاری اور دوسری بولیاں محدود کردار کی بجائے زبانوں کا درجہ لینے کے لیے کوشاں ہیں ۔ سرائیکی صوبے کا نعرہ اس پر مستزاد ہے ۔ آزاد کشمیر میں کشمیری زبان کا رقبہ نہ ہونے کے برابر ہے ۔ گوجری اور میرپوری کے مطالبات بھی اٹھ رہے ہیں ۔ شمالی علاقہ جات میں آٹھ دس لسانی حلقے ہیں ۔ اردو کا مقابلہ انگریزی کی بجائے ان لسانی مسائل سے جوڑنے کی کوششیں جاری ہیں ۔ قوم کی جگہ قومیتوں کے تصورات نے اس لسانی جنگ کو اور بھی تیز کر رکھا ہے ۔ زبانوں کو اظہار کا وسیلہ جاننے کی بجائے ماں بولی کا تصور زبانوں کو " پوجا " کی چیز بنانے پر مصر ہے ۔ اسی لیے تو نصف صدی پہلے علامہ اقبال نے قومیت کے مغربی تصور کی مخالفت کی تھی اور اسے اسلامی معاشرے کے لیے بے حد خطرناک قرار دیا تھا ۔ فکر اقبال میں سیاسی اور سماجی جدوجہد کا محور اسی مسئلے کو بنایا گیا ۔ اب حالات زیادہ دگرگوں ہیں ۔ آج سائنسی ایجادات نے دنیا کے دور افتادہ ممالک کو قریب تر کر دیا ہے ۔ ایک ملک میں رونما ہونے والے واقعات کی خبریں فوراً دوسرے ملک پہنچتی ہیں ، اس کے ساتھ ثقافتی یلغار کی ریل پیل بھی بڑھ گئی ہے اور الیکٹرانک میڈیا کا دخل زیادہ ہو گیا ہے ۔ ایسے میں بیرونی اثرات کے رد و قبول کے عمل کو کئی نئی اور مرکب صورتوں کا سامنا ہے ۔ اس کی زد سب سے زیادہ ہماری اخلاقی قدروں پر پڑی ہے

علامہ اقبال کے نزدیک اخلاقی قدریں اضافی نہیں بلکہ دائمی ہیں ۔ علامہ ان قدروں کو معاشرتی زندگی میں بحال رکھنے کے حامی تھے ۔ ان کے زمانے میں کشمکش اتنی تیز نہیں ہوئی تھی لیکن ہمیں تو کئی نئے چیلنج بھی درپیش ہیں ۔ ان مسائل سے آنکھیں چار کرتے ہوئے ہمیں احتیاط سے کام لینا ہو گا ۔ خصوصاً معاشرے کی طبقاتی تقسیم بہت توجہ چاہتی ہے ۔ میں نے چند برس پہلے " پاکستانی قومیت کی تشکیل نو" میں جو کچھ لکھا تھا اس میں سے ایک اقتباس آج کے خطبے کے اختتامئے کے طور پر پیش کرتا ہوں:

" نظام تعلیم کے حوالے سے 'مادری زبان" کا مسئلہ اٹھایا جاتا ہے لیکن اصل مسئلہ مختلف صوبوں کے درمیان رابطے کا ہے ، مادری تعصبات کا نہیں ۔ اگر کسی ایک صوبے کی زبان بھی (چاہے وہ اکثریتی صوبہ ہی کیوں نہ ہو) باقی صوبوں کے لیے قومی سطح پر قابل قبول نہیں تو پھر اس کا حل وہی زبان ہو گی جو سب صوبوں میں یکساں طور پر سمجھی جاتی ہو اور ظاہر ہے کہ وہ انگریزی نہیں ہو سکتی ۔ صوبائی سطح پر علاقائی زبانوں کو پوری طرح نشو و نما کا حق ہے ۔ کلچر اور علاقائی زبانوں کو بنیاد بنایا جائے تو پھر صوبوں کے باشندوں کو صوبائی سطح پر ایک زبان اور ملکی سطح پر دوسری زبان قبول کرنے کے لیے تیار رہنا چاہئے ۔ اس حالت کو نظام تعلیم کے حوالے سے دیکھا جائے تو ابتدائی درجوں میں آج بھی مضامین کی تدریس علاقائی زبانوں میں ہو رہی ہے لیکن تعلیم کے اعلیٰ درجوں میں بعض مضامین میں اردو ذریعہ تعلیم ہے ، بعض میں انگریزی ۔ انگریزی اور اردو کی یہ دو عملی تعلیمی نظام کے لیے بڑی تشویش ناک ہے ۔ اس کے نتائج خاصے تباہ کن ثابت ہو رہے ہیں ۔ ملکی سالمیت کی خاطر یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ مستقبل میں کون سی زبان قومی ہو گی ۔ صوبوں کی سطح پر اعلیٰ درجوں تک اگر ذریعہ تعلیم مقامی زبانیں بنتی ہیں تو پھر ان کے اور قومی زبان کے درمیان کوئی قابل عمل فارمولا وضع کرنا ہو گا ۔ یہ حل اس بات پر منحصر ہے کہ مرکز میں کس زبان کو قومی سطح پر قبول کیا جائے اور قومی زبان کو امور ملکی میں جس بنیادی لسانی صلاحیت کی ضرورت ہے اس کا اہتمام کیا جائے ۔ ظاہر ہے اگر صوبائی سطح تک صوبائی زبانیں رائج کی جاتی ہیں تو قومی زبان میں عمدہ صلاحیت پیدا کرنے کے لیے صوبوں کے نظام تعلیم میں اردو کے لیے کچھ خاص اہتمام کرنا پڑے گا ۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں ، جب تک مرکز اور صوبوں کے تعلیمی محکموں میں اختیارات کی از سر نو تقسیم نہ ہو اور ملکی ضروریات اور صوبائی ضروریات میں حد فاصل قائم نہ ہو ۔ ان حدود کے تعین سے مرکز گریز رجحانات کا خاص طور پر سدباب کرنا ہو گا تاکہ صوبائی اور قومی زبانوں کے درمیان ہم آہنگی ہو سکے ۔

یہ مسئلہ بھی سوچنے اور غور کرنے کا ہے کہ ایک ترقی پذیر ملک میں افراد قوم کی زیادہ تر صلاحیتیں محض زبانیں سیکھنے کی نذر نہ ہو جائیں ۔ ان سب مسائل کا تقاضا یہ ہے کہ

لسانی معاملات کو ملکی مفادات کی روشنی میں طے کرکے زبانوں کی درجہ بندی کا طریق وضع کیا جائے ۔ تعلیم کا مسئلہ بہر حال لسانی مسئلے کے قابل قبول حل کے بغیر طے نہیں ہو سکے گا"

حواشی

۱ ۔ مقالات اقبال ص ۱۳۶ ۔ ۱۳۴)

۲ ۔ گفتار اقبال ، ص ۴

۳ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ڈاکٹر ملک حسن اختر کی کتاب " اقبال ----- ایک تحقیقی مطالعہ " ص ۸۵ تا ۱۴۵ ، ۱۴۷ تا ۳۱۹

۴ ۔ اقبال نامہ حصہ دوم ، ص ۲۸۲ مکتوب مورخہ -----

۵ ۔ ایضاً ص ۱۲۳

۶ ۔ کلیات مکاتیب اقبال جلد دوم ، ص ۳۲۲ مکتوب مورخہ ۳۰ جنوری ۱۹۲۲ء

۷ ۔ ایضاً ص ۱۶۷ ، ۱۶۸

۸ ۔ یونیورسٹی کیلنڈر ۱۹۲۵ء --- ۱۹۲۴ ص ۳۲۴

۹ ۔ یونیورسٹی کیلنڈر ۱۹۲۲ء -- ص ۱۷۲

۱۰ ۔ یونیورسٹی کیلنڈر ۲۴ ۔ ۱۹۲۳ء -- ص ۳۱۳

۱۱ ۔ ایضاً ۳۱۵

۱۲ ۔ ایضاً ۳۲۴

۱۴ ۔ گفتار اقبال ص ۱۳۵

۱۵ ۔ ایضاً ص ۱۵۷

۱۶ ۔ ایضاً ص ۱۵۳

۱۷۔ ایضاً ص ۱۵۴

۱۸۔ مقالات اقبال ص ۱۳۵۔۱۳۶

۱۹۔ ایضاً ص ۲۱۵

۲۰۔ ایضاً ص ۲۱۷

۲۱۔ ایضاً ص ۲۲۴

۲۲۔ گفتار اقبال ص ۸۳ مقالہ شریعت اسلام ، مرد اور عورت کا رتبہ ۷ جنوری صد ۱۹۲۹ کو انجمن خواتین اسلام کے سپاس نامہ کے جواب میں

۲۳۔ ایضاً ص ۷۶

۲۴۔ ایضاً ص ۷۶۔۷۷

۲۵۔ مقالات اقبال ص ۱۳۸

۲۶۔ ایضاً ص ۱۳۸

۲۷۔ اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۶۲ مکتوب مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۱۳ء

۲۸۔ مقالات اقبال ص ۲۱۱۴

۲۹۔ اقبال نامہ حصہ اول ص ۵۶ مکتوب مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۲۳ء

۳۰۔ اقبال نامہ حصہ دوم ص ۸۵

۳۱۔ ایضاً ص ۷۹۔۷۸

۳۲۔ پاکستانی قومیت کی تشکیل نو ص ۴۲۔۴۳